اداریہ

خورشید احمد ندیم

نوآبادیاتی دور کے خاتمے پر جو مسلمان ریاستیں دنیا کے نقشے پر نمودار ہوئیں، ان کی نظریاتی شناخت، ابتدائی دور ہی میں ایک اہم بحث کا عنوان بنی۔ آزادی کا یہ عمل بیسویں صدی کے وسط میں اپنی تکمیل کو پہنچا۔ عالمی سطح پر یہ دور دو حوالوں سے اہم شمار ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ قومی ریاست کے تصور کو بالعموم قبول کر لیا گیا اور دنیا بھر میں ممالک اسی قومی شناخت کے ساتھ ایک دوسرے سے ممتاز قرار پائے۔ دوسرا یہ کہ سرمایہ دارانہ ریاست اور اشتراکی ریاست کا تصادم نمایاں ہوا۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت دو مختلف نظام ہائے سیاست وحکومت کے طور پر سامنے آئے۔ مسلمان ممالک جب آزاد ہوئے تو ان دونوں فکری نظاموں کا تصادم ہر جگہ زیر بحث تھا۔ آزادی کے بعد جب مسلمانوں نے اپنی اجتماعی سیاسی شناخت دریافت کرنا چاہی تو ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ قومی ریاست کے تصور اور سرمایہ داری واشتراکیت کی کشمکش سے صرف نظر کر سکیں۔ اس کے ساتھ ریاست کے باب میں مسلمانوں کا اپنا تاریخی تجربہ بھی تھا جس کا آخری مظہر خلافت عثمانیہ کی صورت میں چند دہائیاں پہلے تک موجود تھا۔ علاوہ ازیں یہ تاریخی جبر بھی ایک امرِ واقعہ کے طور پر موجود تھا کہ مسلمان نئی عالمی جغرافی تبدیلیوں کے نتیجے میں کئی قومی ریاستوں میں بٹ چکے تھے۔ اس پس منظر میں جب انہیں اپنی اجتماعیت کے فکری خدوخال واضح کرنا پڑے تو اسلامی فکر تعبیر کے ایک عمل سے گزری۔ اس کے چند نتائج کچھ اس طرح ہمارے سامنے آتے ہیں:

۱- سرمایہ داری اور اشتراکیت کی طرح اسلام بھی ایک سیاسی نظام ہے جو ان دونوں سے مختلف ہے۔

۲- اسلام جغرافیہ یا نسل کو شہریت کی اساس نہیں مانتا بلکہ نظریہ اسلامی ریاست کی بنیاد ہے۔

۳- اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے، لہٰذا وہ جدید ریاست کے لیے ایک نظام کی تشکیل میں بھی خود کفیل ہے۔

۴- اسلام جمہوریت کا مخالف نہیں ہے، تاہم جن امور میں قرآن وسنت نے واضح احکامات دے دیے ہیں، ان کو جمہور اپنی رائے سے تبدیل نہیں کر سکتے۔

۵- جس ملک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں قومی ریاست کا تصور اسلامی ریاست سے متصادم نہیں ہے۔

۶- جن مسائل میں قرآن وسنت میں واضح راہنمائی نہیں ملتی وہاں اجتہاد سے کام لیا جائے گا۔

۷- اسلام نجی ملکیت پر کسی قدغن کو قبول نہیں کرتا، اس لیے اسلام اشتراکیت سے یکسر مختلف ہے۔

جو لوگ ''اسلامی ریاست'' کو اشتراکی یا سرمایہ دارانہ ریاست کے متبادل کے طور پر پیش کر رہے تھے، انہوں ان سب باتوں کو ایک مربوط تخیل اور استدلال کے پیش کیا اور اس پر اصرار کیا کہ نئی آزاد ہونے والی مسلمان ریاستوں کو اسی ماڈل پر قائم ہونا چاہیے۔ تاہم یہ واحد نظام فکر نہیں تھا جو مسلمان معاشروں میں موجود تھا۔ اس کے ساتھ وہ لوگ بھی تھے جن کی رائے میں اجتماعیت کے حوالے سے اشتراکی تصور کو بنیاد بنانا چاہیے۔ اسی طرح یہ رائے بھی موجود تھی کہ ایک جدید قومی ریاست جن خطوط پر استوار ہے، مسلمانوں کو بھی اسی ماڈل کو اختیار کر لینا چاہیے اور مروجہ معنوں میں انہیں جمہوری ریاست بننا چاہیے۔ اس اختلاف رائے نے ابتدا ہی میں ایک نظریاتی کشمکش کو جنم دیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست کا تصور ان معاشروں میں مضبوط تر ہوتا گیا۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۴۹ء میں قرارداد پاکستان منظور کر کے ریاستی سطح پر پاکستان کے اسلامی تشخص کو قبول کر لیا۔ سعودی عرب میں، دو خاندانوں کے مابین ایک معاہدے کے نتیجے میں مذہب کے ایک ریاستی کردار پر اتفاق کر لیا گیا۔ ایران میں علماء کی جدوجہد نے ۱۹۷۹ء میں ایک اسلامی انقلاب برپا کر دیا۔ سوڈان میں ایک فوجی انقلاب کے بعد اسلام ایک بھرپور سیاسی عامل کے طور پر ابھرا اور ۱۹۹۶ء میں جب افغانستان میں طالبان کا اقتدار قائم ہوا تو یہاں بھی ایک اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔

مختلف مسلمان معاشروں میں جب اسلام کے سیاسی واجتماعی کردار کو عملاً تسلیم کرلیا گیا تو پھر وہ بحث جو ابتدائی عہد میں محض نظری تھی، اب درپیش عملی مسائل سے متعلق ہوگئی۔ اسلام کا وہ پہلو جو قانون سے بحث کرتا ہے، اسے بالعموم شریعت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ نفاذ شریعت ایک عملی مسئلے کی عنوان بن گیا۔ جب نفاذ شریعت کے لیے عملی اقدامات کیے گئے تو بالعموم اس کے وہ نتائج سامنے نہ آئے جن کی توقع کی جارہی تھی۔ مسلمانوں کو یہ بتایا گیا تھا کہ نفاذ شریعت سے ان کے تمام معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل حل ہوجائیں گے جس طرح کہ ماضی میں خلافت راشدہ یا پھر بعد کے ادوار میں ہوا لیکن عملاً کہیں اس عہد کی کوئی مثال دہرائی نہ جاسکی۔ مثال کے طور پر پاکستان میں آئین اسلامی ہوگیا اور ۱۹۷۹ء سے ملک میں حدود قوانین بھی نافذ ہیں لیکن معاشرے کی اخلاقی ہیئت میں کوئی تبدیلی آئی ہے نہ سیاسی ومعاشی مسائل ہی حل ہوئے ہیں۔ ایران میں ۱۹۷۹ء سے مسلسل علماء کی حکومت ہے لیکن ایران جنت نظیر نہیں بن سکا۔ یہی معاملہ دیگر مسلمان معاشروں کا بھی رہا۔

سوال یہ ہے کہ نفاذ شریعت کا یہ عمل کیوں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا۔ اس کا تعلق ہمارے فہم دین اور مطالعہ سماج سے ہے یا اس کے اسباب خارجی ہیں؟ ''اجتہاد'' کا یہ خصوصی شمارہ اصلاً اسی سوال کو زیر بحث لاتا اور اس ضمن میں نظری مباحث کے ساتھ نفاذ شریعت کے معاصر تجربات کا ایک تجزیہ بھی ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ مثال کے طور ڈاکٹر محمد شکیل اوج کا مضمون بیان کرتا ہے کہ نفاذ شریعت کے باب میں قرآن مجید ہمیں کیا راہنمائی دیتا ہے۔ اسی طرح حافظ عمار خان ناصر نے ایک مبسوط مقالے میں اس سوال کا جائزہ لیا ہے کہ مسلمان معاشروں میں نفاذ شریعت کے باب میں کیا غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اس کے لیے تقدیم وتاخیر کے پہلو سے کن امور کا لحاظ ضروری ہے اور یہ کہ نفاذ شریعت کے نتیجے میں اصلاً کس مقصد کا حصول پیش نظر ہے۔

معاصر تجربات کے باب میں پاکستان، ایران اور نائیجیریا کے تجربات بطور خاص موضوع بحث ہیں۔ ڈاکٹر محسن نقوی نے ان پر ایک جامع تبصرہ تحریر کیا ہے جبکہ ڈاکٹر ناصر زیدی نے ایران میں آنے والی اس اہم تبدیلی کا ایک نظری جائزہ ہمارے سامنے رکھا ہے۔

حال ہی میں نفاذِ شریعت کی اس بحث نے ہمارے لیے غیر معمولی اہمیت اختیار کرلی جب فاٹا کے علاقوں میں بعض مسلح گروہوں نے ریاست کی عمل داری کو ختم کرتے ہوئے، بالفعل اپنی حکومت قائم کرلی ہے اور اپنے فہم دین کے مطابق نفاذِ شریعت کے لیے بعض عملی اقدامات بھی اٹھائے ہیں۔ سوات میں حکومت نے اپنی رٹ قائم کرنے کے لیے ایسے ہی ایک گروہ کا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے نظام عدل ریگولیشنز کے نفاذ کا اعلان کردیا۔ خیال یہ کیا گیا کہ اس صورت میں مسلح گروہوں کی طرف سے ریاست کی عمل داری کو قبول کرلیا جائے گا اور یوں خطے میں امن قائم ہوجائے گا۔ بعد میں پیش آنے والے واقعات کی شہادت یہ ہے کہ امن کی یہ توقع پوری نہ ہوسکی اور فساد کا دروازہ بدستور کھلا ہے۔ اس صورت حال میں مزید پیچیدگی اس وجہ سے پیدا ہوگئی کہ فاٹا کے بعض حصوں میں طالبان کے نام سے شہرت رکھنے والے ایک گروہ نے بعض بزرگوں کے مزارات کو نشانہ بنایا جس پر بریلوی مکتب فکر میں ردِعمل پیدا ہوا اور اس طرح نفاذِ شریعت کے باب میں ایک گروہ کے اقدامات نے پہلے سے موجود مسلکی اختلاف کو کشیدگی کی سطح تک پہنچا دیا۔ سوات میں نفاذِ شریعت کا مطالبہ مولانا صوفی محمد کی قیادت میں قائم تحریکِ نفاذِ شریعتِ محمدی کی طرف سے سامنے آیا جس کا فاٹا اور سوات میں جاری مسلح جدوجہد سے کوئی براہِ راست تعلق نہ تھا۔ مولانا صوفی محمد کے خیالات جب تفصیل کے ساتھ لوگوں نے سنے تو نفاذِ شریعت کی اس بحث نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا اور یہ بات سامنے آئی کہ نفاذِ شریعت کے مطالبے میں ظاہری یکسانیت کے باوجود مذہبی طبقات اس کی تفصیل میں کس قدر مختلف الخیال ہیں۔ اس ساری بحث کو سمجھنے کے لیے اجتہاد کے اس شمارے میں شامل مولانا صوفی محمد کا تفصیلی انٹرویو بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر فاروق خان کے مضمون سے بھی اس صورت حال کو جاننے میں مدد مل سکتی ہے۔

نفاذ شریعت کے حوالے سے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ہمارے اہل علم اس تصور اور معاصر تجربات کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے جہاں پاکستان کے نامور اہل علم کے انٹرویوز شامل اشاعت ہیں وہاں ترکی کے معروف سکالر جناب فتح اللہ گولن کا ایک انٹرویو بھی دیا جارہا ہے۔ اسی طرح دو کتابوں پر تبصرہ بھی اس شمارے کا حصہ ہے جس سے اس موضوع کے بارے میں اہل علم کی آراء معلوم کی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ چند اہم دستاویزات بھی شامل اشاعت ہیں جنہیں پاکستان میں نفاذ شریعت کے باب میں سنگ ہائے میل قرار دیا جاسکتا ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ ''اجتہاد'' کا یہ خصوصی شمارہ اس موضوع پر ایک دستاویز ثابت ہوگا اور جو سنجیدگی کے ساتھ نفاذ شریعت کے اس عمل کو سمجھنا چاہے، اس کے لیے مفید بنیاد فراہم کرے گا۔